Vol.4 No.2 2021
ISSN Online: 2709-7625
ISSN Print: 2709-7617

اردو ناول میں تاریخی اور تہذیبی شعور

☆ڈاکٹر سجاد نعیم
اسسٹنٹ پروفیسر، شعبہ ءاردو، دی اسلامیہ یونیورسٹی بہاولپور
☆☆محمد اویس
ایم فل اسکالر، شعبہ ءاردو، بہاالدین زکریا یونیورسٹی، ملتان

ABSTRACT:

The journey of exploring these angles in the functions and geographical features of human life in any region has been the subject of research since then, that human life has been going through these stages from time to time.These stages are not only a description of the forms of material development, but also a search for the historical changes that have been telling the story of the cultural consciousness of history from generation to generation.Because from the very beginning, human life has been a part of its life, making clear changes of consciousness according to its surroundings from moment to moment.Function is a genre that seeks to reach human beings of human attitudes, history and cultural consciousness that have been forgotten in ordinary human life. And above all, the novel does its job of interpreting them all correctly, this genre is a complete story of any region. In this genre, from general life to the philosophical basis of civilization and consciousness is made the subject. The history of Urdu novel is not very old but still it emerged as a powerful genre in Urdu literature. From the beginning till now, most of the Urdu novels seem to contain historical and cultural consciousness. The Urdu novel made sensitive and delicate issues of history its subject with great care. This article is a continuation of the same series, in which we will review the evolutionary forms of historical and cultural consciousness in chronological order so that a complete picture of it emerges.

Vol.4 No.2 2021
ISSN Online: 2709-7625
ISSN Print: 2709-7617

کوئی بھی ہئیت اپنی مخصوص شکل کو تبدیل نہیں کرتی بلکہ اس کے باطن میں تبدیلیاں واقع ہوتی رہتی ہیں۔ کچھ ایسا ہی معاملہ تاریخ اور تہذیب کے ساتھ بھی ہے۔ ہم جانتے ہیں کہ ہندوستان میں کثیر الجہت قومیں آباد تھیں۔ ان کے رویے، کھانا پینا، اٹھنا بیٹھنا اور گفتگو میں کسی خاص مزاج کا در آنا، دراصل ان کی نسلی تاریخ اور تہذیب کی جانب اشارہ کرتا تھا۔ ان کے پاس ایک ظاہری ہئیت تو موجود تھی لیکن ان کی خصلتیں وقت کے ساتھ اپنی ابتدائی شکلیں تبدیل کرتی رہی ہیں جو واضح طور پر 'شعور' کے زندہ ہونے کا ثبوت دیتی ہیں۔ بعض اوقات ایسا بھی ہوتا ہے کہ لوگ حال میں گم ہو کر ماضی کی جانب کوئی نگاہ نہیں دوڑاتے جو اس بات کا ثبوت ہے کہ ان کے ہاں شعور کا تسلسل واقع نہیں ہوا۔ مگر جب کوئی فرد لمحہء موجود اور آئندہ کے درمیان طے ہونے والے سفر کو پاٹنے کی کوشش کرتا ہے تو ہم کہتے ہیں کہ اس کے ہاں شعور کی سطح دوسرے لوگوں سے مختلف ہے۔

ہر سماج پر مختلف امتحانات آتے ہیں جن کی بدولت وہ تغیر کے عمل سے گزرتا ہے اور اپنے شعور کو دوسروں کے سامنے پیش کرنے کے لیے علت اور معلول کا سہارا لیتا ہے۔ ہندوستان پر ایک ایسا وقت بھی آیا جب ہر خاص و عام تاریخی و تہذیبی شعور سے تہی دست دکھائی دے رہا تھا۔ ایسے میں انہیں کسی مسیحا کی ضرورت تھی جو ان کے شعور کو بیدار کرے۔ پھر ہم دیکھتے ہیں کہ ڈپٹی نذیر احمد، سر سید احمد خان اور حالی جیسے اعلیٰ اور ارفع اذہان سامنے آئے جنہوں نے ادب کی متنوع جہات تخلیقی فن پارے پیش کیے۔ اگر ہم اردو ناول کا جائزہ لیں تو اس میں ڈپٹی نذیر احمد سے لے کر اکیسویں صدی کے ناولوں تک تاریخی اور تہذیبی شعور کی سطحیں تبدیل ہوتی رہی ہیں جو بذات خود تخلیقی شعور کی بلندی اور عظمت کی عکاس ہیں۔

یاد رہے جب فرد کی عامیانہ زندگی پر کوئی ضرب لگتی ہے تو وہ عصری صورت حال سے قطع تعلق ہو کر اپنے ماضی کی جانب مراجعت کرنا چاہتا ہے۔ ایسے حالات میں ہی اظہار کے نئے وسیلے تشکیل پاتے ہیں اور فرد کے تاریخی اور تہذیبی شعور کی کایا کلپ ہوتی ہے۔ تاریخ، تہذیب اور ثقافت کے میلانات و اختلافات کا لامختتم سلسلہ نئی تخلیقی جہت کو آواز دے رہا ہوتا ہے، جو اس بات کی نوید ہوتی ہے کہ ہمارے سامنے تاریخی اور تہذیبی شعور کا نیا سلسلہ شروع ہونے والا ہے۔ اس میں صرف تہذیبی یا تاریخی شعور شامل نہیں ہوتا بلکہ وہ تمام عناصر شامل ہوتے ہیں جو کسی بھی فرد کے شعور کو مستحکم کرتے ہیں۔ مذکورہ مضمون میں ان ناولوں کی نشاندہی کی جائے گی جن میں تاریخی و تہذیبی شعور کی مختلف پرتیں موجود ہیں اور آج کے قاری کو نئے مفاہیم عطا کر رہی ہیں۔

Vol.4 No.2 2021
ISSN Online: 2709-7625
ISSN Print: 2709-7617

ہر صنف اپنے معروض سے جنم لیتی ہے۔ بعض اصناف تو ایسی ہیں جنہیں خود کو منوانے کے لیے کئی طرح کی پابندیوں اور رکاوٹوں کا سامنا کرنا پڑا ہے جبکہ فکشن کی روایتی اصناف پر اگر نظر ڈالی جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ جیسے برصغیر کے لوگ تو ناول جیسی عظیم صنف کے لیے ترسے ہوئے تھے اور اس پر کوئی اعتراض بھی کیسے اٹھاتا۔ مغرب میں ناول اپنے قدم جما چکا تھا اور جب یہ اردو میں آیا تو اس وقت وہاں ٹالسٹائی، دوستوفسکی، اناطول فرانس، جیمز جوائس اور گوگول جیسے ناول نگار اپنے شاہکار پیش کر چکے تھے ۔ جنہیں آج بھی ناول کا قاری بڑے انہماک سے پڑھتا ہے، اور سمجھتا ہے کہ فرانسیسی، لاطینی اور روسی ناول پڑھے بغیر جینا بھی بھلا کوئی جینا ہے۔ میرا خیال ہے کہ اب وہ دن لد گئے جب روایتی اذہان اس بات پر زور دیا کرتے تھے کہ ناول کسی دوسری صنف کی توجیہی شکل ہے۔ ہندوستان کے نوجوان ناول نگار اور نقاد رحمن عباس کا خیال ہے کہ اردو میں اب تک ایسا کوئی ناول تخلیق نہیں کیا گیا جو خالصتاً داستانوی فضا کو پیش کرتا ہو۔ "داستان اپنے عہد کی ضرورت تھی اور ناول اپنے عہد کا تقاضا"۔[۱] ہر ناول کسی نہ کسی تاریخی حقیقت سے ہم آہنگ ہوتا ہے جو ہر عہد میں مختلف معنی فراہم کرتا ہے۔ یہ تخصیص کرنے کی قطعاً ضرورت نہیں کہ فلاں ناول کو کس زمرے میں رکھنا ہے بلکہ ضرورت تو اس امر کی ہے کہ ہر عہد میں ناول کی تشکیل نو کی جائے اور دیکھا جائے کہ وہ مخصوص عہد میں قاری سے کن معنوں میں ہم کلام ہونا چاہ رہا ہے۔

وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ انسان اپنا محاسبہ کرتا رہتا ہے۔ جس سے اس کے اندر تاریخی اور تہذیبی شعور زندہ رہتا ہے ۔ وہ مختلف محرکات کا جائزہ لیتا ہے۔ جس کی وجہ سے اس کا تاریخی یا تہذیبی شعور بدلتا ہے۔ اس کے ہاں یہ روایت اجتماعی ہوتی ہے ۔ خاص طور پر برصغیر میں کوئی بھی فرد انفرادی طور پر مذہبی، سیاسی، تاریخی اور تہذیبی شعور کا تصور بھی نہیں کر سکتا تھا۔ کیونکہ یورپ کی نسبت یہاں پر انفرادی کی بجائے اجتماعی حقیقت کارفرما رہی ہے۔ نذیر احمد کے ناولوں کا بھی یہی مسئلہ تھا کہ ان میں فرد کی ذاتی شناخت کی بجائے اجتماعی صورتحال زیادہ اہمیت رکھتی تھی۔ جس بناء پر نذیر احمد کے کردار جامد اور اکہرے دکھائی دیتے ہیں۔ ان میں زندگی کی رمق اتنی ہی ہے کہ وہ اپنے تہذیبی و تاریخی شعور کو پیش کر سکیں۔

ناول زندگی کی حقیقت کو پیش کرتا ہے، پھر ہم یہ کیسے تصور کر سکتے ہیں کہ اس سے تاریخی و تہذیبی شعور منہا ہو گا۔ ناول میں برتے جانے والے موضوع کی جڑیں سطحی نہیں بلکہ وہ تو کسی بھی خطے میں اتنی گہرائی سے پیوست ہوتی ہیں کہ تاریخ اور تہذیب خود بخود ابل کر کرداروں کے ذریعے ناول میں پھیل جاتی ہے۔ ڈپٹی نذیر احمد کا ناول "مراۃ العروس" ۱۸۶۹ئ میں طبع ہوا۔ ناول نگار

Vol.4 No.2 2021
ISSN Online: 2709-7625
ISSN Print: 2709-7617

نے اس میں عورتوں کے حقوق کے لیے آواز اٹھائی ہے۔اردو میں یہ تانیثی تحریک کی ابتدا تھی۔ایسا پہلی بار ہو رہا تھا کہ فکشن کے ذریعے نذیر احمد نے عورتوں کے حقوق کو اپنا موضوع بنایا۔یوں نذیر احمد کی انقلابی سوچ نے زوال شدہ معاشرے میں عورت کے تحفظ کا ذمہ لیا۔"مراۃ العرس" کے پہلے باب میں ناول نگار ناصحانہ انداز میں رقم طراز ہیں کہ:

"اے لڑکیو! ایسا ہنر حاصل کرو کہ عورت ہونے پر تم کو اس سے خوشی اور فائدہ ہو۔بے شک عورت کو خدا نے مرد کی نسبت کسی قدر کمزور پیدا کیا۔لیکن ہاتھ، پاؤں، آنکھ، یاداشت، سوچ سمجھ بہت چیزیں مردوں کے برابر عورتوں کو دی گئی ہیں۔لڑکے ان ہی چیزوں سے کام لے کر ہر فن میں طاق اور ہر ہنر میں مشتاق ہو جاتے ہیں۔لڑکیاں اپنا وقت گڑیاں کھیلنے اور کہانیاں سننے میں کھو لتی ہیں۔ویسی ہی بے ہنر رہتی ہے اور جن عورتوں نے وقت کی قدر پہچانی اور اس کو کام کی باتوں میں لگایا۔ہنر سیکھا، لیاقت حاصل کی، وہ مردوں سے کسی بات میں ہیٹی نہیں رہیں۔[۲]

اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ نذیر احمد کافی حد تک اپنے عہد کی لڑکیوں کی تربیت کے لیے فکر مند تھے اور اس بات پر زور دیا کہ وہ برابر تعلیم حاصل کریں اور بعد میں کسی بھی فن میں مہارت حاصل کر کے خدمات انجام دیں۔آج کے عہد میں اگر ایک نظر موجودہ سماج پر ڈالی جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ پاکستان کے بعض علاقوں میں تو خواتین کو یہ حق ہی حاصل نہیں ہے کہ وہ مردوں کے برابر کام کریں۔اس ناول کے ذریعے جو تاریخی شعور سامنے آتا ہے وہ آج کے تناظر میں ایک انقلابی قدم سے بھی تعبیر ہو سکتا ہے۔

ابن الوقت میں ڈپٹی نذیر احمد نے مسلمانوں کی اس ذہنی کیفیت کو دکھایا ہے جو ان کو اشرافیہ بننے کی طرف راغب کرتی ہے اور کردار کسی انفرادی عمل کی بجائے مجموعی حقیقت کو پیش کرتے ہوئے نظر آتے ہیں، یوں ناول میں تاریخی و تہذیبی شعور کے علاوہ سماجی شعور بھی جھلکتا ہے۔ابن الوقت کا کردار انسانی رویوں کی عکاسی کرتا ہے کہ لوگ اپنے مفادات کے لیے وقت کے دھارے سے ہم آہنگ ہو کر جدھر کی ہوا چلتی ہے اسی جانب سفر کی جستجو کرتے ہیں۔اگر آج کے تناظر میں اس ناول کو دیکھا جائے تو ہمارے ہاں ایک منفی پہلو ہی سامنے آتا ہے کہ سیاست میں لوگ ہر آنے والے الیکشن میں جماعت تبدیل کر لیتے ہیں۔اس کے علاوہ روزمرہ میں بھی کئی ایسے لوگ ہیں جو اپنے مفادات حاصل کرنے کے لیے انہیں لوگوں کی طرف جاتے ہیں جو اقتدار میں یا کسی بھی شعبے میں کرسی نشین ہوتے ہیں۔

Vol.4 No.2 2021
ISSN Online: 2709-7625
ISSN Print: 2709-7617

نذیر احمد نے ابن الوقت کے ذریعے مسلمانوں اورانگریزوں کے درمیان پائی جانے والی مماثلت یاایسا بننے کی خواہش میں جو ایک نیا تاریخی و تہذیبی شعور جنم لے رہا تھااس کو بہتر انداز میں پیش کیا ہے۔ناول نگار نے اپنے کرداروں کے ذریعے ناول کو ایک دستاویز کی صورت رقم کیا ہے جس کو ہر عہد میں مختلف انداز میں سمجھا جاسکتا ہے۔

نذیر احمد کے بعد سرشار نے بطور ناول نگار اپنا منفرد مقام حاصل کیا۔ انہوں نے ڈپٹی نذیر احمد کی طرح روایتی یا اصلاحی قصوں کو ناول میں جگہ نہیں دی بلکہ لکھنؤ کی زوال شدہ معاشرت کو ناول میں پہلی بار برتا۔لیکن ناول نگار نے کرداروں میں ایسے امکانات پیدا کیے ہیں کہ وہ پھر سے لکھنؤمیں میلے ٹھیلے روایتی فقرے بازی اورزندگی کو بھرپور طریقے سے لطف اندوز کرنا چاہتے ہیں۔ فسانہ آزاد سے پتہ چلتا ہے کہ اس عہد میں روایات اور اقدار کس طرح تہہ وبالا ہورہی تھیں۔ نئی زندگی کس طرح سے کھوئے ہوئے رنگوں کی تلاش میں تھی۔ سرشار کے سامنے نذیر احمد کے ناولوں کے نمونے موجود تھے۔یوں لگتا ہے کہ انہوں نے ان غلطیوں سے اپنا دامن بچایا ہے جو نذیر احمد سے سرزد ہوچکی تھیں۔ سرشار کے کردار آزاد ہیں وہ اپنی مرضی سے کھلی فضا میں سانس لیتے ہیں جبکہ نذیر احمد کے ہاں صورتحال بہت مختلف ہے۔

"فسانہ آزاد" میں کسک اور محرومی ملتی ہے کہ تمام کردار پرانے لکھنؤ میں زندگی گزارنے کی تمنا کرتے ہیں۔ناول ایک علامت کے ذریعے اپنے مخصوص عہد کے افق پر طلوع ہوتا ہے کہ جس سے کردار ماضی کی گرد میں اٹے ہوئے نظر آتے ہیں۔ مگر نئی تہذیب ان کو قبولنے سے انکاری ہے۔لہٰذا یہاں کرداروں کے ہاں جو تہذیبی شعور نمایاں ہوتا ہے وہ نہ صرف ناول کو نیا موضوع عطا کرتا ہے بلکہ جدید ناول کی سمت نمائی بھی کرتا ہے۔

ڈپٹی نذیر احمد اوررتن ناتھ سرشار کے بعد ناول کے تیسرے دور کا جائزہ لیا جائے تو اس میں عبدالحلیم شرر کا نام نمایاں ہے جنہوں نے تاریخ کو اپنے ناولوں کا حصہ بنایا اورایسے تاریخی کردار پیش کیے جو اس وقت کے مسلمانوں کے لیے رول ماڈل ثابت ہوئے ۔"فردوس بریں" کے بعد اگر شرر کے کسی ناول کو اہمیت حاصل ہوئی تو وہ "ملک العزیز ورجینا" ہے جو ۱۸۸۸ئ میں چھپا۔اس ناولٹ میں شرر نے انگریزی ناول "ٹیلسمان" کا جواب دیا تھا۔کہا جاتا ہے کہ شرر نے اگر "ٹیلسمان" نہ پڑھا ہوتا تو شاید وہ ناول نگاری کی طرف نہ آتے۔شرر کا ناول کی طرف آنا شعوری نہیں بلکہ حادثاتی فیصلہ تھا۔شرر کے ناولوں میں ایک مسئلہ درپیش ہے کہ ان کے

Vol.4 No.2 2021
ISSN Online: 2709-7625
ISSN Print: 2709-7617

ناولوں کے کردار تاریخی زبان بولنے کی بجائے انیسویں صدی کا اسلوب اختیار کرتے ہیں جس وجہ سے ناول پر تاریخ کا ٹھپا تو لگتا ہے مگر ان کے ہاں کرداروں یا ماحول کی عکاسی اپنے عہد کی تاریخ کے ہاتھ ہم آہنگ ہوتی نظر نہیں آتی۔

ہمیں یہاں یہ بحث نہیں کرنی کہ ناول نگار کس حد تک تاریخی حقائق سے انصاف کر سکا ہے۔ اگر ہم اپنی مرکزی بحث کی طرف لوٹیں تو معلوم ہوتا ہے کہ "فردوس بریں" کا اطلاق آج کے تناظر میں بڑی حد ممکن ہے۔ افغان مہاجرین اور نائن الیون کے بعد پاکستان کو جن مسائل کا سامنا کرنا پڑا ہے، ان کا تجزیہ اس ناول کے تناظر میں کیا جا سکتا ہے۔ جس طرح سے نوجوانوں کی برین واشنگ کی جاتی ہے اور ان کو خود کش حملوں کے لیے تیار کیا جاتا ہے اس کی جھلک "فردوس بریں" میں بھی ملتی ہے۔ ناول سے اقتباس دیکھئے کہ:

شیخ۔ دیکھو تمہیں اب کی نامل نہ ہو۔ مجھے اندیشہ ہے کہ تمہارے دل میں بدگمانی پیدا ہو اور تم اپنی ساری محنت ضائع کر دو۔ خوب یاد رکھو کہ ہر ظاہر کا ایک باطن ہے۔

حسین۔ خوب یاد ہے اور مجھے ذرا تامل نہ ہو گا۔

شیخ۔ تو جاؤ امام نجم الدین نیشاپوری کو قتل کر دو۔

حسین۔ بہتر، اگر میں مار ڈالا گیا؟

شیخ۔ کوئی مضائقہ نہیں، بلا زحمت زمرد سے جا ملو گے۔ مگر مجھے معلوم ہے ایسا نہ ہو گا۔" [۳]

شرر اس وقت آگاہ تھے کہ تاریخی شعور اس عہد میں کس قدر ناگزیر ہے کیونکہ اس کے ذریعے ہی آپ تہذیب اور ثقافت کو اپنے فکشن کا حصہ بناتے ہیں اور ایک طرح سے تاریخی ناول محض تاریخی نہیں رہتا بلکہ وہ اپنے اندر تہذیبی و ثقافتی شعور کا بھی آئینہ دار ہوتا ہے۔

نذیر احمد، سرشار اور شرر کے بعد رسوا ایسے ناول نگار ہیں جن کو پہلا کامیاب ناول نگار تسلیم کیا جاتا ہے۔ کہا جاتا ہے کہ قرۃ العین حیدر اگر "آگ کا دریا" نہ لکھتی تو اردو ادب میں اب تک "امراؤ جان ادا" کو ہی بہترین ناول کے نمونے کے طور پر پیش کیا

Vol.4 No.2 2021
ISSN Online: 2709-7625
ISSN Print: 2709-7617

جاتا۔اس ناول میں رسوا نے جو تجربہ کیا ہے وہی رسوا کو باقی ناول نگاروں سے جدا کرتا ہے۔ناول میں مختلف عناصر کار فرما ہیں جو اسے کلاسیک کا درجہ عطا کرتے ہیں۔ یہ اردو کا پہلا باقاعدہ ناول ہے جس میں لکھنؤ کی معاشرت کا تاریخی اور تہذیبی شعور دکھایا گیا ہے۔ ناول میں رسوا نے صرف طوائف کے کلچر کو ہی موضوع نہیں بنایا بلکہ معروض سے جڑے ایسے تلخ حقائق بیان کیے یہیں کہ پوری زندگی سمٹ کر ناول میں آگئی ہے۔

ناول میں جہاں ایک طوائف کی نفسیاتی کیفیت کو بیان کیا گیا ہے وہیں تاریخی اور تہذیبی جھلکیاں بھی دکھائی دیتی ہیں۔ ایک اور بات بھی قابل ذکر ہے کہ جس سماج میں عورت کو محض عیش و عشرت کا سامان سمجھا جاتا تھا اس کے ذریعے ناول نگار نے ایسی عورت کا روپ دکھایا جس کی آنکھ سے لکھنؤ کی زوال شدہ معاشرت کی جانب نقب لگائی گئی ہے۔ یہ ایسا تاریخی شعور ہے جو اپنی گہری معنویت کے ساتھ آج بھی اردو ناول کی تاریخ میں منفرد حیثیت رکھتا ہے۔

جب پریم چند نے ناول لکھنے کا آغاز کیا تو ان کے علاوہ ناول خال خال ہی نظر آتا ہے۔ترقی پسند تحریک کا آغاز ہوا تو چند اصلاحی ناول نگار ہی سامنے آتے ہیں۔پریم چند نے عصری تاریخ کا جو شعور ناول میں برتا اس کی نظیر ڈھونڈنے سے بھی نہیں ملتی۔ ۱۹۳۰ئ کے بعد ناول کا نیا جنم ہوا۔پریم چند کے علاوہ اوپندر ناتھ اشک، کرشن چندر، راجندر سنگھ بیدی، سجاد ظہیر، عصمت چغتائی اور عزیز احمد نے چند اہم ناول تخلیق کیے۔پریم چند کے ناولوں میں "گئودان" سب سے مضبوط اور فکری طور پر پختہ ناول ہے۔اس میں "ہوری" کا کردار نمایاں ہے جس کے ذریعے اس عہد کے کسانوں کی نمائندگی کی گئی ہے۔یہ ناول کسان کا رزمیہ پیش کرتا ہے ۔"گئودان" میں پریم چند نے حقیقت پسندانہ رویہ اختیار کیا ہے۔انہوں نے اس وقت کے ہندوستان کے تہذیبی اور تاریخی شعور کو اپنے ناول میں جگہ دی ہے۔"مگر اپنے عہد میں کسانوں کے حالات پر جس قدر عمدگی اور وضاحت سے انہوں نے تحریریں لکھی ہیں۔ وہ تاریخ کا حصہ ہیں۔"[۴]

"گئودان" کے ذریعے جو سماجی شعور اجاگر کیا گیا ہے اس کی بازگشت آج بھی سنائی دیتی ہے۔ اس عہد میں جس طرح کسانوں کا استحصال کیا جارہا تھا آج کے کسان کی حالت بھی جوں کی توں ہے۔نہ جانے وہ کتنی خواہشوں، امنگوں اور امیدوں کا بوجھ اپنے کندھوں پر ڈال کر بنجر زمین کو نرم کرتا ہے۔ صرف اس لیے کہ ایک دن اس کے تمام خواب سچ ہوں گے مگر خسارے کی چڑیا کسی آفت کی طرح اس کے کچے آنگن میں اڑتی رہتی ہے۔پریم چند خود بھی اس بات سے بخوبی آگاہ تھے کہ جدید سماج کا رزمیہ ناول

Vol.4 No.2 2021
ISSN Online: 2709-7625
ISSN Print: 2709-7617

جیسی عظیم صنف میں ہی کیا جاسکتا ہے۔ اسی لیے "کفن" کے بعد انہیں "گئودان" لکھنے کی ضرورت محسوس ہوئی۔ یہ ناول سماج کی مجموعی اقدار کے ٹھہرے ہوئے پانی میں عصری شعور کا ایسا پتھر ثابت ہوتا ہے جس میں "گاندھی تحریک" کو ایک بار پھر سرگرم دکھایا گیا ہے اور لوگوں کے اندر تاریخی شعور پیدا کرنے کی کوشش کی۔ ناول میں سیاسی، معاشی شعور کے علاوہ ثقافتی تاریخ کی جھلک بھی نمایاں ہے۔ یہ ناول ترقی پسند تحریک کے لیے ایک زرخیز زمین مہیا کرتا ہے۔

سجاد ظہیر کا ناول "لندن کی ایک رات" اس وقت طبع ہوا جب ناول کی روایت مستحکم ہو چکی تھی اور موضوعات کے حوالے سے ناول طویل سفر کر چکا تھا۔ پریم چند کے بعد جو بھی ناول نگار سامنے آتے ہیں انہوں نے عالمی ادب کے اثرات قبول کیے اور ان کے ادب میں اس کے نقوش بھی دیکھے جاسکتے ہیں۔ ان میں سجاد ظہیر بھی شامل ہیں۔ "لندن کی ایک رات" پر یہ الزام لگایا جاتا ہے کہ انہوں نے یہ ناول جیمس جوائس کے "یولیسیس" سے متاثر ہو کر لکھا۔ سجاد ظہیر خود ترقی پسند تھے مگر اس ناول میں کہیں بھی پرولتاریہ انداز نظر نہیں آتا سوائے "احسان" کے کردار کے جو مارکسی نظریات رکھتا ہے مگر عملی طور پر کہیں بھی نظریات کو بروئے کار نہیں لاتا۔ اس ناول میں چونکہ شعور کی رو برتی گئی ہے اس لیے یہ تاثراتی ناول محسوس ہوتا ہے اور ہر کردار عجیب طرح کی ذہنی الجھنوں کا شکار نظر آتا ہے وہ لندن میں رہتے ہوئے بھی ہندوستان کو یاد کرتا ہے اور اس کا دل وہیں دھڑکتا ہے۔

سجاد ظہیر کی توجہ اس امر پر ہرگز مرکوز نہ تھی کہ تقسیم کو ہونا چاہیے یا نہیں بلکہ وہ تو اس بات سے زیادہ پریشان تھے کہ تقسیم کے بعد جو مسائل پیدا ہونے ہیں ان سے کیسے نپٹنا ہے۔ اس لیے ان کے ہاں تمام کردار نوجوان ہیں جو محبت کرنے کے ساتھ ساتھ اپنے خطے کے مسائل سے بھی آگاہ ہیں اور ان کے ہاں بالغ تاریخی شعور نظر آتا ہے۔ ناول سے ایک پیراگراف دیکھئے:

"تم سب کے سب رئیس بنے، مہاجن، بیرسٹر، وکیل، ڈاکٹر، پروفیسر، انجینئر، سرکاری نوکر، جونک کی طرح ہو اور ہندوستان کے مزدوروں اور کسانوں کا خون پی کر زندہ رہتے ہو۔ ایسی حالت قیامت تک قائم نہیں رہے گی۔ کسی نہ کسی دن تو ہندوستان کے لاکھوں کروڑوں مصیبت زدہ انسان خواب سے چونکیں گے بس اسی دن تم سب کا ہمیشہ کیلئے خاتمہ ہو جائے گا۔ احسان نے اپنے کرخت پنجابی لہجے میں کہا۔"[۵]

Vol.4 No.2 2021
ISSN Online: 2709-7625
ISSN Print: 2709-7617

سجاد ظہیر کے ہاں جو تاریخی شعور ملتا ہے وہ ان کے نظریات کی وجہ سے انفرادیت کا حامل ہے اور اس کی گہری چھاپ ناول میں بھی جابجا دکھائی دیتی ہے۔ سجاد ظہیر نے اپنے اس ناول کو کوئی خاص اہمیت نہیں دی ہے لیکن اس میں جو عصری شعور ملتا ہے وہ آج بھی ہم سے مکالمہ کرنا چاہتا ہے اور اس کی اہمیت اکیسویں صدی میں بھی تر و تازہ ہے۔

ترقی پسند ناول نگاروں میں کرشن چندر منفرد مقام رکھتے ہیں۔ اس کی وجہ ان کے اعلیٰ پائے کے ناول ہیں جن میں "جب کھیت جاگے"، "ایک گدھے کی سرگزشت"، "ایک عورت ہزار دیوانے"، "دل کی وادیاں سو گئیں"، "مٹی کے صنم" اور "شکست" شامل ہیں۔ فنی لحاظ سے کرشن چندر کا "شکست" سب سے مضبوط ناول ہے۔ اس میں کشمیر کی دیہاتی زندگی کو پیش کیا گیا ہے۔ ناول میں محبت کی دو کہانیاں بیان ہوتی ہیں جس کے تحت نہ صرف وہاں کے سماج کی عکاسی کی گئی ہے بلکہ کرداروں کے ذریعے تہذیبی و تاریخی شعور بھی پیش کیا گیا ہے۔

ناول میں "چندرا" کا کردار اہمیت کا حامل ہے۔ یہ ایک اچھوت لڑکی ہے جو راجپوت موہن سنگھ سے پیار کرتی ہے۔ چندرا اس بات سے بخوبی آگاہ ہے کہ دھرم کی وجہ سے سماج ان کو ہرگز قبول نہ کرے گا۔ وہ فرسودہ روایات کا گلہ گھوٹنے کی کوشش کرتی ہے اور ایک باغی عورت ٹھہرتی ہے۔ ڈاکٹر عبدالسلام صدیقی کی اس بات سے اتفاق کیا جاسکتا ہے کہ:

"اردو ناول میں سب سے پہلے کرشن چندر نے "شکست" کے ذریعے "چندرا" جیسی باغی عورت کے کردار کو پیش کیا ہے جو کہ سماج اور برادری سے بیزار ہے اور سماجی ناانصافیوں کے خلاف علم بغاوت بلند کرتی ہے۔ اس طرح کا کردار اس سے پہلے اردو ادب میں نہیں ملتا۔"[٦]

سماج میں کئی ایسی لڑکیاں موجود ہیں جو "چندرا" جیسے مسائل میں الجھی ہوئی ہیں وہ محبت کرنا چاہتی ہیں مگر ایسی کئی پابندیاں آڑے آتی ہیں جن کی وجہ سے انہیں موت کو گلے لگانا پڑتا ہے یا بدنامی ان کا مقدر ٹھہرتی ہے۔

اردو ناول کی تاریخ میں عصمت چغتائی کو یہ اختصاص حاصل ہے کہ انہوں نے اپنے ناول "ٹیڑھی لکیر" کے ذریعے خواتین کے نفسیاتی مسائل اور الجھنوں کو پیش کیا۔ عصمت چغتائی وہ پہلی ناول نگار ہیں۔ جنہوں نے دلچسپی کے ساتھ ایسے موضوعات پر لکھا جو اس وقت سماج میں معیوب سمجھے جاتے تھے۔ عصمت چغتائی نے باغی آواز اُٹھائی اور قاری کی توجہ ان مسائل کی طرف دلائی جو

Vol.4 No.2 2021
ISSN Online: 2709-7625
ISSN Print: 2709-7617

اس سے پہلے اس کے لاشعور میں کہیں منجمد تھے۔ "ٹیڑھی لکیر" میں نفسیاتی الجھنوں اور عجیب طرح کی گھمبیرتا کے ذریعے ایسے عوامل کو دکھایا ہے جو ہر عہد میں لڑکیوں کی ذاتی زندگی میں مسئلہ رہے ہیں اور اس میں جنس کو بنیادی حیثیت حاصل ہے۔ یہاں ایسا شعور سامنے آتا ہے جو ہر سماج میں کہیں نہ کہیں موجود ہوتا ہے۔ ناول سے ایک پیراگراف دیکھئے:

" بلقیس سے شمن کی دوستی بھی عجیب وغریب طریقے پر ہوئی۔ ایک دن بلقیس اور وہ بیڈ منٹن کھیل کر پسینہ سکھانے کے لیے چمن کی بنچ پر بیٹھتی تھیں کہ ایک دم سے بلقیس نے پوچھا۔

"تم نجمہ پر مرتی تھیں نا۔ "

"نہیں۔۔۔ نہیں تو۔۔۔ واہ" شمن گھبرا گئی اور قسمیں کھانے لگی۔ "ارے ہم سے جھوٹ بولتی ہو۔۔۔ ہونہہ جیسے ہم جانتے نہیں اور سعادت تمہاری جلتی تھی۔۔۔ کیوں؟ "

"جی ہاں، کبھی بھی نہیں۔ "

"تو اس بات میں بات ہی کیا ہے۔ میں خود پہلے نجمہ پر مرتی تھی۔ مگر آپا بھی نے مجھے بتایا کہ لڑکوں پر مرنا چاہے [۷]"۔

اس ناول میں فرائڈ اور لارنس کے نظریات کا اثر بھی نظر آتا ہے۔ عصمت نے جہاں پہلی بار عورتوں کی جنسی گھٹن اور سماج کا مکروہ چہرہ پیش کیا ہے وہیں عام زندگی کی واضح جھلک بھی دکھائی دیتی ہے۔ ناول میں ان تمام لڑکیوں کے مسائل کو دکھایا گیا ہے۔ جو انہیں زندگی کے تجربے سے حاصل ہوتے ہیں یا پھر اس کا موضوع وہ جنسی محرومیاں ہیں جو عورتوں کے لاشعور میں وقفے وقفے سے دستک دیتی ہیں۔

بنیادی طور پر "ٹیڑھی لکیر" میں دم توڑتی تہذیب کا بیان بھی ہے اور ایک نئی تہذیب جنم لے رہی ہے جو روشن خیالی سے موسوم ہے اور عورتیں گھر والوں کی تعلیمات کی بجائے زندگی اپنی مرضی کے مطابق گزارنے کی خواہش مند ہیں۔ یوں جنسی، نفسیاتی، سماجی اور معاشرتی مسائل سے ایک نیا تناظر ہمارے سامنے آتا ہے۔ عصمت چغتائی نے اپنے ناولوں کے ذریعے نہ صرف نفسیاتی ناول کی بنیاد ڈالی بلکہ اردو ناول کو شعور کی ایک نئی جہت سے بھی روشناس کروایا۔

Vol.4 No.2 2021
ISSN Online: 2709-7625
ISSN Print: 2709-7617

عزیز احمد کا ناول "گریز" اس وجہ سے بھی اہمیت رکھتا ہے کہ اس میں دو تہذیبوں کی کشمکش کو دکھایا گیا ہے۔ ناول کا مرکزی کردار "نعیم" جب برطانیہ میں جدید تعلیم حاصل کرنے جاتا ہے تو اس وقت کا یورپ دوسری جنگ عظیم کے خطرناک نتائج بھگت رہا تھا۔ وہاں کے لوگوں پر نفسیاتی اثرات مرتب ہو رہے تھے اور وہ اپنی زندگیوں کو نئے حالات کے ساتھ ہم آہنگ کرنے کی کوشش کر رہے تھے۔ ہندوستان میں بھی اس وقت سامراجی قوت غالب تھی اور لوگ آزادی کا جذبہ لے کر اپنے تئیں جدوجہد میں مصروف تھے۔ مشرقی اور مغربی تہذیبیں بحران کا شکار تھیں اور وہاں کے لوگ شکست وریخت کی گرد میں اٹے ہوئے تھے۔ ایسی صورت میں جب "نعیم" برطانیہ جاتا ہے تو اسے اپنی محرومیوں کا بخوبی علم ہوتا ہے مگر وہ وہاں کے رواج کے مطابق ہی خود کو ڈھالتا ہے اور زندگی کو نئے زوایے سے دیکھتا ہے۔

ناول میں پائے جانے والے کردار تاریخی، تہذیبی، ثقافتی اور سیاسی شعور سے آگاہ ہیں۔ صرف مشرقی تہذیب کے کردار ہی نہیں بلکہ مغربی کردار بھی اشتراکی نظریات کے حامی ہیں اور ایسے نظام کو لانا چاہتے ہیں کہ تمام حقوق برابر تقسیم ہوں۔ یوں "گریز" کے ذریعے ایسی تہذیبی اور تاریخی دستاویز سامنے آتی ہے جو ہم پر فکر کے نئے زوایے کھولنے کی کوشش کرتی ہے۔ حمیرا اشفاق کا خیال ہے کہ "اس دستاویزی مرقع کی پرتیں جب کھلتی ہیں تو ایک طرف کہانے کے اوقات قاری کو اپنی گرفت

میں لئے رہتے ہیں تو دوسری طرف تاریخ سے دلچسپی رکھنے والوں کیلئے ایسی تاریخی پرتیں کھلتی چلی جاتی ہیں جن میں جمہوریہ سپین کی جنگ سے لے کر دوسری عالمی جنگ کی تفصیلات تک تاریخ ایک دستاویزی گلدستے کی صورت اختیار کر لیتی ہے۔ مشرق و مغرب کی تہذیبی اقدار کی شکست وریخت اس کی ایک اور جہت ہے۔"[۸] "گریز" کے کردار عصری شعور سے پوری طرح واقف ہیں اور ان کے ہاں ایسے فکری رویے سامنے آتے ہیں جس سے ایک عہد کی تاریخ مکمل طور پر سامنے آتی ہے۔ ناول سے چند سطریں دیکھئے:

"کونے پر ایک میز پر کارل مارکس کی بڑی سی تصویر چاندی کے چوکھٹے میں لگی ہوئی تھی۔ اعجاز نے وہ تصویر دکھا کر کہا "یہ وہ مورتی ہے جس کی ہم صبح وشام پوجا کرتے ہیں۔"[۹]

عزیز احمد نے اپنے اس ناول میں تکنیک کے ساتھ ہیئت کی سطح پر بھی ایسے تجربات کیے ہیں جو اس سے پہلے کسی بھی ناول نگار کے ہاں نہیں ملتے۔ "گریز" میں عزیز احمد کے فن کے ساتھ تاریخی اور تہذیبی شعور کا ایسا خمیر تیار ہوتا ہے جو اس عہد کو ہمارے سامنے زندہ کر دیتا ہے۔

Vol.4 No.2 2021
ISSN Online: 2709-7625
ISSN Print: 2709-7617

تقسیم کے بعد جس ناول نگار کے ناولوں کو بطور نمونہ پیش کیا جا سکتا ہے۔ اس میں قرۃ العین حیدر کا نام نمایاں ہے۔ ان کے بیشتر ناولوں میں تقسیم کے مناظر دیکھے جا سکتے ہیں۔ ہندوستان کی تقسیم ایک ایسا سانحہ تھا جس نے نہ صرف انسان کی نفسیات اور اس کے رویوں پر اثرات مرتب کیے بلکہ ادب بھی اس کے وار سے محفوظ نہ رہ سکا۔ ناول نگاروں نے نئے سماجی، تاریخی، تہذیبی اور سیاسی شعور کو اپنے انداز میں برتا اور ہمیں تقسیم کے بعد کا ناول نئے رستے پر گامزن نظر آتا ہے۔

قرۃ العین حیدر کا ناول "آگ کا دریا" اپنے اندر ہندوستان کی ڈھائی ہزار سالہ تاریخ کو سموئے ہوئے ہے۔ یہ ناول چار حصوں میں منقسم ہے جن میں ہندوستان کے مختلف ادواروں پر گہری نظر ڈالی گئی ہے۔ قرۃ العین حیدر کے دو ناول "میرے بھی صنم خانے" اور "سفینۂ غم دل" بھی اسی جانب اشارے کرتے ہیں جن میں ہندوستان کو مشترکہ تہذیب کے آئینے میں پرکھنے کی کوشش کی گئی ہے۔

"آگ کا دریا" میں موجود کرداروں کے ہاں صرف گزشتہ زندگی کی رمق ہی دکھائی نہیں دیتی بلکہ وہ خود کو بدلتے تناظرات میں پرکھتے ہیں اور اپنا تاریخی شعور پروان چڑھاتے ہیں۔ ناول میں یہ دکھانے کی کوشش کی گئی ہے کہ وقت ایک طرح "آگ کا دریا" ہے جس میں انسان کی حیثیت محض اس تنکے کی طرح ہے جس کو ہر صورت جلنا ہے۔ اس کے پاس ایسا کوئی فن نہیں کہ وہ اپنے ارتقاء کو روک دے بلکہ وہ تو مسلسل تاریخ کے جبر کا شکار رہتا ہے۔ ناول میں پورے ہندوستان کی روح کو سمجھنے کی جستجو کی گئی ہے۔ یوں وقت کے ذریعے ایسا شعور سامنے آتا ہے جو ہر فکر کی نمائندگی کرتا ہے۔ خورشید انور کے بیان کو یہاں درج کرنا اہمیت سے خالی نہ ہو گا لکھتے ہیں کہ "قرۃ العین حیدر کے تاریخی شعور کا سب سے اہم اور نمایاں پہلو ان کا وقت کا شعور ہے۔ دراصل قرۃ العین حیدر کے مختلف ناول [خصوصاً آگ کا دریا] وقت کے گہرے شعور کی بنیاد پر ہی اس قدر کامیاب ہو سکے۔"[۱۰] ناول کے ہر کردار میں تاریخی و تہذیبی شعور کی مختلف پرتیں موجود ہیں جو جگہ جگہ پر آشکار ہوتی ہیں اور اپنے عہد سے مکمل طور پر ہم آہنگ نظر آتی ہیں۔

فضل احمد کریم فضلی کا ناول "خون جگر ہونے تک" اہمیت کا حامل ہے جس میں قحط بنگال کے دنوں میں انسانوں کی تاریخی، ثقافتی اور تہذیبی زندگی کو متاثر ہوتے دکھایا گیا ہے۔ بنگال کے متعلق ہمیں "آخر شب کے ہم سفر" میں بھی کافی کچھ پتہ چلتا ہے لیکن "خون جگر ہونے تک" میں ایسی ناانصافیاں ملتی ہیں کہ ہر چیز کھوکھلی دکھائی دیتی ہے۔ اس ناول میں ایسی تباہ کاریاں دیکھنے کو ملتی ہیں کہ اس

Vol.4 No.2 2021
ISSN Online: 2709-7625
ISSN Print: 2709-7617

سے نہ صرف تہذیبی ورثہ متاثر ہو رہا ہے بلکہ لوگوں کے ہاں ایسا تاریخی شعور جنم لے رہا ہے جو ان کو مستقبل کی جانب سفر کرنے کی ہمت بھی دے رہا ہے۔ شیبا عالم کا خیال ہے کہ "اس ناول کی سیاسی اور تاریخی حوالے سے تہذیبی فضا کا اگر مشاہدہ کیا جائے تو ایک بات یہ سامنے آتی ہے کہ بنگال ہمیشہ سے مرکز سے دور رہنے کی وجہ سے حقوق کی پامالی کا شکار رہا ہے۔ فضل احمد کریم فضلی کا یہ ناول آج ایک اور ہی تعبیر پیدا کر رہا ہے۔ جس کی طرف کسی نقاد نے توجہ نہیں دی۔"[۱۱]

شوکت صدیقی کو سماجی حقیقت نگاری کے طور پر بھی جانا جاتا ہے بعض ناقدین نے تو ان کو پریم چند کی توسیع قرار دیا ہے۔ شوکت صدیقی کے چار ناول منظر عام پر آئے جن میں "کمیں گاہ"، "خدا کی بستی"، "جانگلوس" اور "چار دیواری" شامل ہیں۔ ان کے ناولوں میں "خدا کی بستی" کو سب سے زیادہ شہرت نصیب ہوئی۔ اس ناول میں بنیادی طور پر پاکستان بننے کے بعد کراچی کو جن مسائل کا سامنا کرنا پڑا ان کو نئے تناظر میں دیکھنے کی کوشش کی گئی ہے اور وہ وجوہات سامنے آتی ہیں جن کی وجہ سے مختلف طرح کے مسائل پیدا ہوئے۔ یہ مسائل آج بھی نہ صرف کراچی میں بلکہ پاکستان کے قریباً ہر علاقے میں موجود ہیں۔

میرے خیال میں "خدا کی بستی" سے بھی زیادہ تاریخی اور تہذیبی شعور ہمیں ان کے ناول "چار دیواری" میں ملتا ہے۔ اس میں لکھنؤ کی زوال شدہ معاشرت کو دکھایا گیا ہے۔ اس وقت بادشاہی نظام ختم ہو رہا تھا اور اشرافیہ شکست و ریخت کا شکار تھی۔ لوگ اپنے ماضی کو یاد کر کے حال میں پیش آنے والے مسائل کو ان کے ساتھ جوڑنے کی کوشش کر رہے ہیں اور وہ وجوہات تلاش کر رہے ہیں جن کی وجہ سے انگریز کی حکومت کیوں مضبوط ہوئی۔ ناول میں نظر آتا ہے کہ ایک تہذیب اپنی آخری سانسیں گن رہی ہے جبکہ نئی تہذیب جنم لے رہی ہے۔ ستار طاہر اپنے مضمون میں لکھتے ہیں کہ:

"یہ اس لکھنؤ کی کہانی ہے جہاں طاقوں میں چراغ روشن ہو گئے تھے۔ چھتوں میں گیس کے ہنڈے لٹکتے تھے اور جب ناول اختتام کو پہنچتا ہے تو لکھنؤ میں بجلی کی روشنی آچکی ہوتی ہے۔ چائے کی پبلسٹی شروع ہو چکی ہوتی ہے۔ لوگ ایک نئے مشروب اور ذائقے سے آشنا ہو رہے ہوتے ہیں۔ یہ ناول ہمیں قدیم اور موجود لکھنؤ کے جغرافیہ سے بھی متعارف کراتا ہے اور جو تبدیلیاں رونما ہوئیں وہ بھی اس ناول کا حصہ بنتی ہیں۔ قدیم لکھنؤ کی بعض انوکھی اور حیران کن رسموں سے قارئین پہلی بار آشنا ہوتے ہیں۔[۱۲]

Vol.4 No.2 2021
ISSN Online: 2709-7625
ISSN Print: 2709-7617

کرداروں کے ہاں ہمیں ایسا تہذیبی شعور ملتا ہے جو اس بات کی عکاسی کرتا ہے کہ وہ لوگ نئے عہد میں کن روایات کی کمی محسوس کر رہے ہیں۔ جگہ جگہ ہمیں اس مخصوص ناسٹلجیا بھی نظر آتا ہے جو ان کے تہذیبی شعور کو پروان چڑھانے میں اپنے انمٹ نقوش مرتسم کر چکا ہوتا ہے۔ ناول سے چند سطریں ملاحظہ کیجئے:

"یوں سمجھ لو، ولی عہد کے زمانے میں واجد علی شاہ نے دل بہلانے کیلئے پری خانے کے نام سے ایک عشرت کدہ بنا رکھا تھا'۔ حضور بیگم نے مغلانی کو آگاہ کیا۔ 'افروزی خاتم بتاتی تھیں کہ پری خانے کیلئے خوبصورت اور نوجوان لڑکیاں ڈھونڈ ڈھونڈ کر لائی جاتی تھیں۔ رات دن ناچ گانے کی محفلیں جمی رہتی تھیں۔ جو لڑکیاں پری خانے میں نئی نئی داخل ہوتیں اور ناچ گانے سے واقف نہ ہوتیں ان کی تعلیم و تربیت کیلئے باقاعدہ گویے ملازم تھے۔"[۱۳]

ناول میں ایسے کئی حوالے ملتے ہیں جہاں اس بات کا ادراک ہوتا ہے کہ کرداروں کے اندر تہذیبی شعور موجود ہے جس کی سطحیں مختلف ہیں۔ ناول کی فضا پُر اسرار، تحیر سے بھرپور اور آسیب سے مزین ہے۔ جہاں نہ صرف الف داستانوی ماحول نظر آتا ہے بلکہ وہاں کے لوگ توہمات پر بھی پورا اعتقاد رکھتے ہیں۔ اس ناول کو ہمارے ہاں نظر انداز کیا گیا لیکن یہ ہم سے تقاضا کرتا ہے کہ اس کی پڑھت نئے زاویے سے ہو، تاکہ تہذیبی شعور مزید کھل کر سامنے آسکے۔

ناول نگاری کی روایت میں خدیجہ مستور منفرد اور اہم مقام رکھتی ہیں۔ انہوں نے اردو ادب کو دو ناول "آنگن" اور "زمین" عطا کیے۔ ایک طرح سے "زمین"، "آنگن" کی موضوعاتی توسیع ہے۔ "آنگن" کا موضوع تقسیم سے پہلے کے حالات ہیں۔ اس میں خانگی نظام کے زیر اثر ہی باقی تمام چیزوں پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ ناول میں سیاسی، سماجی اور تاریخی شعور کی واضح جھلک ملتی ہے۔ ہم یہ تو نہیں کہہ سکتے کہ خدیجہ مستور کا تاریخی، سیاسی یا سماجی شعور اپنے ہم عصر ناول نگاروں [قراۃ العین حیدر یا عبداللہ حسین] کی طرح تھا۔ "آنگن" کے ذریعے پورے سماج کی نمائندگی ہوتی ہے۔ ڈاکٹر منصور خوشتر کا خیال ہے کہ "آنگن ایک ایسی علامت پیش کرتا ہے جو اپنے اندر اس زمانے کی بھرپور جدوجہد کے اثرات کو اپنے اندر سمیٹے ہوئے ہے۔ چچا کا "آنگن" صرف گھریلو زندگی کی عکاسی نہیں کرتا بلکہ پورے ہندوستانی معاشرے کی حالت بیان کرتا ہے جو دوسری جنگ عظیم سے قبل تھی۔"[۱۴] آنگن کو اس وجہ سے بھی اہمیت حاصل ہے کیونکہ یہ ایسے موضوع کو اپنے اندر سمیٹے ہوئے ہے جب مسلمان اشرافیہ دباہی کے دہانے پر کھڑی تھی۔ یہ ناول صرف ایک گھرانے تک محدود نہیں رہتا بلکہ اس میں عالمی صورت حال کی بھی عکاسی ملتی ہے جو نئے طرح کے شعور کو

Vol.4 No.2 2021
ISSN Online: 2709-7625
ISSN Print: 2709-7617

فروغ دے رہی ہے:"جاپان بھی ہارنے والا ہے ان کا ایک پورا کا پورا شہر تو تباہ ہو گیا۔"[۱۵] یہاں ہندوستان اور عالمی صورتحال کا موازنہ کیا گیا ہے۔اس سطر میں جو تاریخی شعور ابھرتا ہے کہ جب اپنے سماج کے حالات معمول پر نہ ہوں تو ہم خود کو عالمگیریت کے تناظر میں رکھ کر پرکھتے ہیں اور کچھ لمحوں کیلئے مقامیت کا تصور نفی ہو جاتا ہے۔ اس وقت کے ہندوستان کے حالات جاپان کی صورتحال سے کسی قدر کم نہ تھے۔

ناول میں تہذیبی شعور بھی ملتا ہے جو نہ صرف ہندوستانی تہذیب کا عکاس ہے بلکہ اس میں مذہبی یگانگت بھی نظر آتی ہے جسے کسی صورت آج بھی اپنے آنگن سے ختم نہیں کیا جا سکتا۔ رمضان کے مہینے میں ایک خاص طرح کی فضا آج کے عہد میں بھی ہمیں دکھائی دیتی ہے۔گھر کے افراد جب گروہ کی صورت میں افطاری کیلئے بیٹھتے ہیں تو اس میں ہر طبقہ کے لوگوں میں تہذیبی رنگ جھلک رہا ہوتا ہے جو انہیں وراثت میں ملتا ہے:

"جب وہ نیچے گئی تو سب لوگ افطاری کے نشے میں مست سے بیٹھے تھے۔کریمن بوا روٹیاں پکانے میں لگی ہوئی تھیں۔برآمدے میں بچھے ہوئے پلنگوں پر بیٹھی ہوئی بڑی چچی اور اماں پان بنا بنا کر کھا رہی تھیں اور جمیل بھیا اس سردی میں اپنی لوہے کی کرسی پر بیٹھے اسٹول پر رکھی ہوئی لالٹین کی روشنی میں پڑھ رہے تھے۔"[۱۶]

خدیجہ مستور کا ناول "زمین" ان کی زندگی میں تو شائع نہ ہو سکا لیکن اس میں پاکستان بننے کے بعد کے جن مسائل کو موضوع بنایا گیا ہے وہ آج بھی اہمیت کے حامل ہیں۔ اس ناول میں بھی تاریخی شعور ملتا ہے اور پاکستان بننے سے پہلے لوگوں نے جو خواب دیکھے تھے وہ تقسیم ہند کے بعد ٹوٹ کر چکنا چور ہوئے۔ ناول کے کرداروں کے ہاں جو فکری رجحان پایا جاتا ہے وہ آج کے تناظر میں بھی کہیں سچ لگتا ہے۔

"اداس نسلیں"عبداللہ حسین کا فکری، فنی اور موضوعاتی لحاظ سے اہم ناول ہے۔ناول کی کہانی جنگ عظیم اول سے شروع ہوتی ہے اور تقسیم ہند کے بعد تک جا کر دم لیتی ہے۔اس ناول میں عبداللہ حسین "آگ کا دریا" سے بھی متاثر نظر آتے ہیں کیونکہ "اداس نسلیں" میں تین ادوار شامل ہیں جن میں برطانوی حکومت کا دور، تقسیم کیلئے جدوجہد اور ۱۹۴۷ء کے بعد کا منظر نامہ ہے۔ جبکہ "آگ کا دریا" چار ادوار پر مشتمل ہے۔ اگر کرداروں کو ان تین ادوار میں تقسیم کر کے دیکھا جائے تو ان کے ہاں ثقافتی، تاریخی

Vol.4 No.2 2021
ISSN Online: 2709-7625
ISSN Print: 2709-7617

اور تہذیبی شعور میں تنوع ملتا ہے جو ہر عہد میں اپنی شکل تبدیل کرتا آیا ہے۔ ناول میں کردار نہ صرف سماج کے متعلق اپنا تاریخی شعور رکھتے ہیں بلکہ وہ مذہب کے متعلق بھی سوالات اٹھاتے نظر آتے ہیں جو ان کے شعور کی بہترین عکاسی کرتے ہیں:

"تمہیں پتا ہے جب سے منظم مذہب کی بنیاد پڑی ہے اسے کتنی بار ناجائز طور پر استعمال کیا گیا ہے؟ مذہب ہماری تھل کے راستے سے دل تک پہنچتا ہے اور وہاں اپنا قبضہ جمالیتا ہے۔ اسے کتنی آسانی کے ساتھ بھڑکایا جا سکتا ہے۔ آج تک کتنی جنگیں مذہب کے نام پر ہوئی ہیں۔ کتنے قحط پڑے ہیں؟ کیا صرف اس لیے کہ مذہب ہمیں محبت کرنا سکھاتا ہے۔"[۱۷]

"اداس نسلیں" کا مرکزی کردار نعیم ہے جو اپنے گاؤں سے جبری طور پر پہلی جنگ عظیم میں بھرتی کر لیا جاتا ہے۔ وہاں وہ طویل جنگی حالات سے نبرد آزما ہوتا ہے۔ یہ ایسی جنگ ہے جہاں ایک ہی نسل کے لوگ آپس میں گتھم گتھا ہیں جبکہ ہندوستانی لوگ اس میں محض مہرے کا کردار ادا کر رہے ہیں۔ اس جنگ میں مسلمان اور باقی نسلوں کے لوگ بھی شامل ہیں۔ جہاں مذہب کی بجائے ایک ایسی قوت ان کو اکٹھا کیے ہوئے ہے جس نے ان کے دلوں میں آزادی کے چراغ جلائے ہوئے ہیں۔ یوں روایتی مذہب کا تصور یہاں نفی ہوتا نظر آتا ہے بلکہ بنیادی حیثیت انسانیت کے مذہب کو حاصل ہے۔ عبداللہ حسین نے کرداروں کے اندر تاریخی شعور کی ایسی چنگاری جلائی ہے کہ وہ اپنے معروضی حالات سے بخوبی واقف ہیں۔ ناول کا یہ ایک جملہ تاریخی شعور پر بھاری ہیکہ "ہم ہندوستان کی اس بدقسمت نسل کے بیٹے ہیں۔"[۱۸] یہ کتنی حیرت کی بات ہے کہ "لندن کی ایک رات"، "گریز" اور "اداس نسلیں" کے مرکزی کردار کا نام "نعیم" ہے۔ اب یہاں کونسا شعور کارفرما ہے اس کو کھوجنے کیلئے طویل بحث کی ضرورت ہے۔ بہر حال "اداس نسلیں" میں جو تاریخی شعور کارفرما ہے ناول نگار نے اس کو برتتے ہوئے اپنے عصری شعور سے چند قدم آگے بڑھنے کی جستجو کی ہے۔

اگر ہم انتظار حسین کی افسانوی جہتیں تلاش کریں تو ہمیں ان کے ہاں تاریخی، تہذیبی اور ثقافتی شعور کا ایک نیا پہلو ملے گا۔ ان کے ناولوں اور افسانوں میں قصہ گو نظر آتا ہے۔ جو تحیر آمیز فضا قائم کر کے کہانی کو آگے بڑھاتا ہے۔ "بستی" انتظار حسین کا پہلا ناول ہے۔ اس ناول میں انتظار حسین نے سقوط ڈھاکہ کے بعد جس طرح سے نوجوانوں، دانشوروں اور فنکاروں کی ذہنیت تبدیل ہوئی ہے اس کو موضوع بنایا گیا ہے۔ ان کے ناولوں میں فرد کسی نہ کسی گرداب میں پھنسا نظر آتا ہے جو ایک طرح سے "کافکائی تکنیک" کی جانب اشارہ بھی ہے۔ ان کے ہاں کردار کسی ناسٹلجیا یا ایسے نفسیاتی مسائل کا شکار ہے کہ اس کے ہر عمل میں کوئی محرومی

Vol.4 No.2 2021
ISSN Online: 2709-7625
ISSN Print: 2709-7617

نظر آتی ہے۔ رضی عابدی کا خیال ہے کہ "ایسا بھی نہیں ہے کہ انتظار حسین کے ناولوں میں لوگ قسمت کے سامنے بے بس ہو کر بیٹھ گئے ہوں۔ وہ سب اپنی اپنی استعداد کے مطابق حالات کا مقابلہ کرنے کی اپنی اپنی ہی کوشش کرتے ہیں۔ کچھ خوش اعتقاد نذر نیاز میں نجات ڈھونڈتے ہیں۔ کچھ خانقاہوں کا رخ کرتے ہیں کچھ وہ ہیں جو اپنے سیاسی و سماجی شعور کے مطابق معاملات کو سمجھنے کی کوشش کرتے ہیں۔"[۱۹] انتظار حسین کے ناولوں میں نہ صرف تاریخی و تہذیبی شعور جھلکتا ہے بلکہ ان کا اسلوب بھی اپنے اندر تاریخی معنویت چھپائے ہوتا ہے۔ ان کا تاریخ سے رشتہ اتنا گہرا نظر آتا ہے کہ اس کو کسی صورت بھی علاحدہ کر کے نہیں دیکھا جا سکتا۔ ان کے ناول "بستی" سے چند سطریں دیکھئے:

"تم لوگوں کی تاریخ ہندوستان میں عجیب اوبڑ کھابڑ چلی ہے۔ پہلے تمہارے فاتحین آئے اور اس زور و شور سے آئے کہ ان کے گھوڑوں کی ٹاپوں سے یہاں کی زمین ہل گئی اور تلواروں کی جھنکار سے فضا گونج اٹھی۔ پھر سیاسی رہنما نمودار ہوئے اور انہوں نے اپنے گھن گھوج دکھائی۔ بابر، اکبر، شاہجہان، اورنگ زیب پھر سر سید احمد خان، مولانا محمد علی، محمد علی جناح اور ان سب کے بعد تمہاری صابرہ۔ بھرے ہندوستان میں اکیلی رہ جانے والی ایک اداس خاموش لڑکی، پتہ نہیں یہ تمہاری تاریخ کا کمال ہے یا تہذیبوں کی تاریخ ہی اس طور چلتی ہے۔"[۲۰]

اس اقتباس میں تاریخ کے کئی رنگ چھپے ہوئے ہیں اور ایک کردار کے ذریعے ایسا تاریخی شعور پیدا کرنا صرف انتظار حسین کا ہی کمال ہے۔

جمیلہ ہاشمی کے ناول اردو ادب میں تاریخی سنگ میل کی حیثیت رکھتے ہیں۔ "دشت سوس" ان کا کامیاب ناول ہے جس وجہ سے جمیلہ ہاشمی کو شہرت نصیب ہوئی۔ اس کے مقابلے میں "تلاش بہاراں" کو وہ پذیرائی حاصل نہ ہو سکی۔ ان کے ناولوں میں پانے جانے والے کردار تاریخی جہتوں سے اپنا تعلق جوڑتے ہیں جو بعد میں روحانی رشتہ بن کر سامنے آتا ہے۔ جمیلہ ہاشمی کے کردار اساطیر سے بھی تعلق جوڑتے ہیں جو علامتی اور استعاراتی سطح پر نئے مفاہیم تلاش کرتے نظر آتے ہیں۔ ناول میں جہاں ہمیں تاریخی حقائق ملتے ہیں وہیں کرداروں کے ہاں تاریخی شعور بھی دکھائی دیتا ہے جو اس بات کی گواہی دیتا ہے کہ ناول نگار نے محض تاریخی واقعات کو اکٹھا نہیں کیا بلکہ انہوں نے عصری شعور کو بھی ملحوظ خاطر رکھا ہے۔ "دشت سوس" سے ایک پیراگراف دیکھئے:

Vol.4 No.2 2021
ISSN Online: 2709-7625
ISSN Print: 2709-7617

"ہمارے مدارس میں مذہب کے تقابلی مطالعہ کرنے والے بہت کچھ جانتے ہیں اور روز روشن کی طرح ان پر سب واضح ہوتا ہے۔ کہاں، کیا ہے وہ بہتر طور پر بتاسکتے ہیں۔" منصور نے فخر سے کہا: "مگر ان تک رسائی ممکن نہیں ہوتی"۔ ہندی نے افسوس سے کہا "کیا تم نے کوشش کی ہے۔ یہاں پر تو ہر رنگ و نسل کے لوگ موجود ہیں۔ دربار کے اندر باہر مدارس میں اور دوسری جگہوں پر عوام کے مجمعوں میں مباحث کی محفلوں میں ہر شخص بار پا سکتا ہے۔ پہلی حکومتوں میں ذرا سختی روا رکھی گئی تھی کہ مسلم اور غیر مسلم میں فرق کرنا ممکن نہیں رہا تھا مگر اب حالات پھر وہی ہیں۔ یہ خلفائے عباسیہ کی رواداری ہے۔ جس نے فرقوں اور خیالوں اور مذہبوں کو رواج دیا ہے۔"[۲۱]

یہاں یہ بات سامنے آتی ہے کہ لوگ اپنے معروضی حالات سے بخوبی واقف ہیں اور ان کے اندر ہر حوالے سے تاریخی شعور موجود ہے۔ ان چند سطروں کو اگر ہم آج کے تناظر میں دیکھیں تو معلوم ہوتا ہے کہ ایسے شدت پسند لوگ موجود ہیں جو نہ صرف نسلی امتیاز روا رکھتے ہیں بلکہ مذہب کو مختلف فرقوں میں پاٹنے کے فن سے بھی بخوبی آگاہ ہیں۔ جس سے کئی طرح کے مسائل جنم لیتے ہیں۔ یہ ناول بہت آہستہ آہستہ واقعات کو آگے لے کر بڑھتا ہے۔ اس سے زمانے کا وہ فکری ارتقاء بھی ہمارے سامنے آتا ہے جس میں نظریات بدلتے رہے یا یوں کہا جا سکتا ہے کہ شعور کا ماخذ تو کوئی ایک ہی تھا مگر عہد بہ عہد اس میں سماج کا تاریخی شعور بھی شامل ہوتا چلا گیا۔

انیس ناگی کے ناولوں کو بھی کسی صورت نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ "دیوار کے پیچھے" ان کا معروف ناول ہے اس کے علاوہ "کیمپ"، "محاصرہ"، "گرم موسم کی کہانی"، اور "زوال" بھی اہم ناول ہیں۔ انہوں نے روایت سے ہٹ کر نیا راستہ اختراع کرنے کی سعی کی جس میں وہ کامیاب بھی ہوئے۔ "دیوار کے پیچھے" ایک مزدور کی کہانی ہے جو انسان کے مکروہ رویوں کا شکار ہو جاتا ہے۔ حساس لوگ تنہائی کے ملبے تلے ایک عجیب طرح کی گھٹن محسوس کر رہے ہیں۔ ان حالات میں ایک پروفیسر کا کردار بھی ہے جو سماج سے بیزار ہو جاتا ہے۔ یہ دور ایوب خان کے مارشل لاء کا ہے۔ یہاں ان مافیہ لوگوں کا چہرہ بھی بے نقاب کیا گیا ہے جو غیر جمہوری طریقے سے ترقی کرتے ہیں۔ انیس ناگی نے زندگی سے چھوٹے چھوٹے کردار اکٹھے کیے ہیں جو سماج سے بغاوت کرنا چاہتے ہیں اور فرسودہ نظام کے خلاف سوال اٹھانا چاہتے ہیں مگر بے بس ہیں۔ ہر کردار ایک نئی سوچ کو جنم دے رہا ہے جو منفرد تاریخی یا ثقافتی شعور کی بھی پرکھ کر رہا ہوتا ہے۔

Vol.4 No.2 2021
ISSN Online: 2709-7625
ISSN Print: 2709-7617

مستنصر حسین تارڑ عصر حاضر کے اہم ناول نگار ہیں۔ انہوں نے اردو ادب کو "قلعہ جنگی"، "راکھ"، "بہاؤ" اور "خس و خاشاک زمانے" جیسے لازوال ناول دیے۔ کچھ ناقدین کا ماننا ہے کہ ان کی فکشن نگاری کا آغاز تو اصل میں "بہاؤ" سے ہوتا ہے۔ یہ ناول ۱۹۹۲ء میں طبع ہوا۔ جس کے بعد اسے بہت سراہا گیا۔ اس کی بنیادی وجہ یہی ہے کہ یہ ناول چولستان کی کئی ہزار سالوں پر محیط تاریخ کو اپنے اندر لیے ہوئے ہے۔ جہاں زندگی کے کچھ آثار باقی ہے۔ اس کے علاوہ وہاں ایک دریا بھی دکھایا گیا ہے جو اب خشک ہو چکا ہے۔ شاید وہاں کے لوگوں کا دیوتا / دیوی ان سے ناراض ہے۔

بہائو میں ہمیں ثقافتی اور تہذیبی شعور ملتا ہے جس سے پتہ چلتا ہے کہ تہذیب کیسے وجود میں آتی ہے اور پھر اس کا نشان کیونکر مٹ جاتا ہے۔ ناول نگار نے دراصل قدیم تہذیب کو بازیافت کرنے کی جستجو کی ہے کہ کیسے وقت تمام چیزوں کے فیصلے کرتا ہے اور انسان اپنے ابتدائی نقوش کو سنبھالنے کی کوشش اپنا سب کچھ قربان کر بیٹھتا ہے۔ لیکن ہمیں تارڑ کے کرداروں کے ہاں جہاں فطرت کے خلاف جدوجہد ملتی وہیں تہذیبی شعور بھی نظر آتا ہے جو ہرگز نظر انداز نہیں کیا جاسکتا۔ "پاروشنی نے گردن کو بل دے کر اپنا دایاں کان بہاؤ کے قریب کیا اور سنا، دریا خاموش تھا بول نہیں رہا تھا جو معلوم ہوتا کہ پڑے پانی آنے کو ہیں۔"[۲۲] ان سطروں سے ہمیں ایسا شعور جھلکتا ہوا دکھائی دیتا ہے جو ہمارا تہذیبی سرمایہ بھی رہا ہے کہ ضعیف لوگ کیسے اپنی لوک دانش سے صرف آسمان کو دیکھ کر پیشین گوئی کرتے تھے اور وہ سچ ہی ثابت ہوتی تھی۔ اسی طرح ہم تارڑ کے "قلعہ جنگی" اور "راکھ" کو بھی نظر انداز نہیں کر سکتے جس میں انہوں نے سیاسی رجحانات کے ذریعے نیا تاریخی شعور پیش کرنے کی کوشش کی ہے۔

اکیسویں صدی جتنے بھی ناول منظر عام پر آئے ان میں ہمیں تاریخی اور تہذیبی شعور کی مختلف سطحیں دکھائی دیتی ہیں۔ تمام ناول اس بات کی دلیل ہیں کہ ناول نگار عصری شعور سے غافل نہیں بلکہ وہ تمام معاملات کو اپنی گرفت میں لینے کی صلاحیت رکھتا ہے۔ اس مختصر مضمون میں جدید ناول نگاروں کو حوالوں کے ساتھ زیر بحث لانا ممکن نہیں اس لیے ان کے صرف نام لیے جاسکتے ہیں ان ناول نگاروں میں مرزا اطہر بیگ، شمس الرحمن فاروقی، عاصم بٹ، خالد فتح محمد، رحمن عباس، سید کاشف رضا، علی اکبر ناطق، طاہرہ اقبال، اختر رضا سلیمی اور زیف سید کے نام نمایاں ہیں۔

Vol.4 No.2 2021
ISSN Online: 2709-7625
ISSN Print: 2709-7617

حوالہ جات

۱۔ رحمن عباس، اکیسویں صدی میں اردو ناول اور دیگر مضامین، عریشہ پبلی کیشنز، نیو دہلی، ۲۰۱۴ئ، ص:۳۷

۲۔ ڈپٹی نذیر احمد، مراۃ العروس، الفیصل ناشران، لاہور، ۲۰۰۸ئ، ص:۴۶

۳۔ مولانا عبدالحلیم شرر لکھنوی، فردوس بریں، مجلس ترقی ادب، لاہور، ۱۹۹۵ئ، ص:۸۱

۴۔ شاہد نواز، پاکستانی اردو ناول میں عصری تاریخ، شعبہ اُردو، یونیورسٹی آف سرگودھا، سرگودھا، ۲۰۱۸، ص:۴۳

۵۔ سمیرا اکبر [مرتب]، لندن کی ایک رات [ایک مطالعہ]، ایس۔اے پبلشرز، ص:۵۵

۶۔ عبدالسلام صدیقی، ڈاکٹر، کرشن چندر کے ناولوں کا تنقیدی مطالعہ، انجمن ترقی اردو [ہند]، ۲۰۰۴ئ، ص:۵۰

۷۔ عصمت چغتائی، ٹیڑھی لکیر، چوہدری اکیڈمی، مکتبہ اردو، لاہور، ۱۹۷۵ئ، ص:۱۰۶

۸۔ حمیرا اشفاق، عزیز احمد [ادب، تاریخ اور تہذیب]، سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور، ۲۰۱۵ئ، ص:۲۴۲

۹۔ عزیز احمد، گریز، موڈرن پبلشنگ ہائوس، نئی دہلی، ۱۹۸۲ئ، ص:۱۰۴

۱۰۔ خورشید انور، قرۃ العین حیدر کے ناولوں میں تاریخی شعور، انجمن ترقی اردو [ہند] نئی دہلی، ۱۹۹۳ئ، ص:۱۳۱

۱۱۔ شیبا عالم، ڈاکٹر، اردو کے نمائندہ ناول نگاروں کا تاریخی شعور، سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور، ۲۰۱۵ئ، ص:۲۰۹

۱۲۔ نثار حسین [مرتبہ]، شوکت صدیقی [افکار و شخصیت] رکتاب پبلی کیشنز، کراچی، ۲۰۱۴ئ، ص:۲۳۳

۱۳۔ شوکت صدیقی، چار دیواری، رکتاب پبلی کیشنز، کراچی، ۲۰۱۰ئ، ص:۴۱۴

۱۴۔ منصور خورشتر، ڈاکٹر، [مرتبہ]، اردو ناول کی پیش رفت، بک ٹاک، لاہور، ۲۰۱۹ئ، ص:۳۳۴

۱۵۔ خدیجہ مستور، آنگن، سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور، ۲۰۰۴ئ، ص:۲۴۱

Vol.4 No.2 2021
ISSN Online: 2709-7625
ISSN Print: 2709-7617

۱۶۔ ایضاً، ص:۱۲۳

۱۷۔ عبداللہ حسین، اداس نسلیں، سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور، ۲۰۰۷ئ، ص:۴۶۱

۱۸۔ ایضاً، ص:۶۱

۱۹۔ رضی عبادی، تین ناول نگار، کتابی دنیا، ۲۰۰۱ئ، ص:۹۳

۲۰۔ انتظار حسین، بستی، سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور، ۲۰۰۷ئ، ص:۱۴۱۔۱۴۲

۲۱۔ جمیلہ ہاشمی، دشت سوس، سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور، ۲۰۰۷ئ، ص:۲۴۰

۲۲۔ مستنصر حسین تارڑ، بہائو، سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور، ۱۹۹۷ئ، ص:۲۰